جلد02 شمارہ16، 2023

Article

Orientalism: Allama Iqbal and Edward Saeed's Intellectual Dimensions: A Review

شرق شناسی: علامہ اقبال اور ایڈورڈ سعید کے فکری ابعاد: ایک جائزہ

Dr. Muhammad Iftikhar Shafi*[1], Dr. Muhammad Rafeeq ul Islam[2]

[1]Professor of Urdu, Govt. College, Sahiwal

[2] Chairman, Department of Iqbalyat& Philosophy,The Islamia University, Bahwalpur

*Correspondence: mohammadiftikharshafi@gmail.com

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع[1]، ڈاکٹر محمد رفیق الاسلام[2]

[1] پروفیسر آف اردو، گورنمنٹ کالج ساہیوال، [2]چیرمین شعبہ اقبالیات و فلسفہ، دی اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:11-09-2023
Accepted:12-11-2023
Online:20-12-2023

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: Allama Muhammad Iqbal and Edward Said, notable critics of Orientalism, offer distinct perspectives shaped by the historical contexts in which they emerged. Iqbal's critique unfolded during British colonialism, reflecting his deep religious convictions. In contrast, Edward Said's analysis arose in the post-colonial era, characterized by a secular outlook as a Christian. Despite their religious differences, both thinkers meticulously scrutinized Western knowledge through their unique lenses. This article provides a comprehensive exploration of the viewpoints of these intellectual giants within the realm of Oriental studies. It delves into the nuanced analyses presented by Iqbal and Said, shedding light on how their diverse backgrounds and temporal contexts influenced their critiques of Western perspectives on the East. Through this comparative examination, the article aims to offer insights into the evolution of Orientalist criticism and the enduring relevance of their contributions in shaping our understanding of intercultural relations.

Keywords: Orientalism, Historical, Psychoanalysis, Colonialism, Intellectual, Exploitation, Linguistic Reconstruction

شرق شناسی (Orientalism) کی اصطلاح سے مراد وہ تصورات واحساسات ہیں جو (گزشتہ چند صدیوں میں) مشرقی قوموں کے بارے میں مغرب (یورپ اورامریکہ) میں رواج پائے ہیں۔ شرق شناسی (Orientalism) محض ایک علم یا تحقیق کا شعبہ ہی نہیں بلکہ انکشافات، معلومات، لسانی تعمیرِ نو، نفسیاتی تجزیات اور معاشرتی تصورات کے ذریعے ایک خطے کی اجتماعی نفسیات کا مکمل ادارک حاصل کرنے کی کاوش ہے۔ شرق شناسی (Orientalism) کے پس منظر میں موجود مقاصد کی کئی پرتیں ہیں، مختلف ادوار میں، اس کا مختلف زاویوں سے مشاہدہ کیا جاتا رہا ہے۔ تاریخی تناظر میں دیکھیں تو جب دو ثقافتیں باہم متصل یا متصادم ہوتی ہیں تو اس سے بر آمد ہونے والے نتائج خاصے دل چسپ ہوتے ہیں۔ شرق شناسی کوئی تصوراتی یا تخیلاتی علم نہیں بلکہ ایک مستقل نظریاتی جہت ہے۔ اس کے پس منظر میں موجود منصوبہ بندی اور سرمایہ کاری واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک مکمل اور مربوط نظام ہے اور اس کے باقاعدہ دینی، سیاسی، اقتصادی، سماجی اور علمی محرکات ہیں۔ اہلِ یورپ کے ہاں اپنی قیمتی نو آبادیات کے مزاج سے آگاہی کی خواہش غیر فطری نہیں تھی۔ بنیادی طور پر شرق شناسی کی اصطلاح عربی کے لفظ "استشراق" سے مشتق ہے جس کا مادہ (ش۔ ر۔ ق) ہے۔ شرف الدین اصلاحی کے مطابق:

> "یہ اصطلاح مغربی اقوام کی وضع کردہ ہے جس کے لیے عربی میں "استشراق" ایک متبادل لفظ ہے۔ 'orient' بہ معنی مشرق اور 'Orientalism' شرق شناسی یا مشرقی علوم وفنون اور ادب میں مہارت حاصل کرنے کے طور پر رائج ہیں۔ مستشرق (استشرق کے فعل سے اسم فاعل) سے مراد ایک ایسا سکالر ہے جو بلا تکلف مشرقی علوم کا ماہر ہو۔"(۱)

صدیوں پہلے حاکم اور محکوم کے درمیان جب ایک بنیادی تفریق پیدا ہوئی تو استعمار کی اصطلاح سامنے آئی۔ شروع میں استعماریت کے آثار قدیم مصریوں، فونیقیوں اور یونانیوں کے ہاں ملتے ہیں۔ ان قوموں نے جبر و تسلط کے زیر اثر اپنے عہد کی پُر امن اور ضعیف اقوام پر تسلط جمایا، اس کے بعد عرب، ترک، روسی، اور آسٹریائی نسلیں نو آبادیاتی قوت کی شکل میں سامنے آئیں۔ قریب کے دور میں برطانوی، فرانسیسی، اطالوی، پرتگالی اور ولندیزی اقوام نے صنعتی و مشینی ترقی کے بعد دنیا فتح کرنے کا خواب دیکھا اور بڑی حد تک اس کی تعبیر بھی پالی۔ عالمی سطح پر روسی ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے مغربی اقوام کے مذموم مقاصد کا پردہ فاش کیا ہے۔ انھی ادیبوں کی کاوشوں کی وجہ سے فی الوقت نو آبادیات اور اس کے متعلقات عالمی ادب کا پسندیدہ موضوع ہیں۔ اہل مغرب نے مشرق کے بارے میں غلط تصورات کو فروغ دے کر معاملات کو گنجلک بنایا تاکہ اپنے قبضے کے جواز کو کسی نہ کسی طرح دلیل سے درست ثابت کر سکیں۔ گذشتہ صدی میں مغرب نے ایک ایسا مشرق تشکیل دینے کی بھرپور کوشش کی ہے جو فکری طور پر مغربی اقوام کا پروردہ اور دلدادہ ہو۔ برصغیر میں تاج برطانیہ نے شعوری طور پر دو کردار (مسٹر اور ملا) پیدا کیے، جب بھی موقع ملا، دونوں کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا گیا۔ مستشرقین نے اپنی تحریروں کے ذریعے مشرقی دانش جو طبقے میں شرمندگی، احساس کمتری اور مشرقی اور مغربی سماج کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے کی تحریک شروع کی۔ انھیں اس میں بڑی حد تک کامیابی بھی ملی۔

ایشیائی اقوام خاص طور پر مسلمانوں کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی بجائے مغرب پر انحصار کرنا سکھایا گیا۔ اس ڈسکورس (Discourse) نے مسلم دنیا پر ایک آکٹوپس کی طرح اپنے پنجے گاڑ لیے ہیں۔ مشرقی اقوام کے لیے بہترین راستہ یہ تھا کہ سامراج کی پیش کی گئی آئیڈیالوجی کو رد کر کے مقامی تصورات سے استفادہ کرتیں۔ مغرب کی بنائی ہوئی اپنے ماضی کی مسخ شدہ تصویروں سے انکار کر کے اس کے ساتھ برابری کی سطح پر مکالمہ کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ضروری تھا کہ خود شناسی کا راستہ اختیار کر کے اپنے بارے میں میں مغرب کے پیش کردہ تصورات کی نفی کر دی جاتی لیکن اس کے

برعکس مرعوبیت کی فضا پیدا ہوئی۔غلامی کے خاتمے کے باوجود مشرقی اقوام میں خوئے غلامی کی متعدد شکلوں نے جنم لیا۔ مستشرقین نے تاریخ،تہذیب وثقافت،لسانیات،علم وادب اور فلسفے میں خدمات ضرور انجام دیں لیکن ان کے علمی کام کی حیثیت مبتدیانہ نوعیت کی تھی۔مستشرقین کی تصانیف سے یہ احساس نمایاں ہوتا ہے کہ انھیں مشرقی تہذیب وتمدن کی بعض بنیادوں چیزوں کا علم بھی نہیں۔مشرقی ممالک کو تہذیب یافتہ بنانے کا دعوے دار مغرب،نو آبادیاتی نظام کے تحت ان ممالک کا استحصال کر کے عالمی بساط پر قابض ہوا ہے۔سامراجی دعوؤں سے مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ اب مابعد جدید نو آبادیاتی نظام میں بھی تیسری دنیا کی ترقی کا راز مغربی ممالک کے مرہونِ منت سمجھا جاتا ہے۔اپنے رائج کردہ علوم کے ذریعے یورپ افریقی اور ایشیائی ملکوں میں نوجوانوں کا ایک ایسا بنا بنایا،ڈھلا ڈھلایا دانش ور طبقہ چاہتا ہے جو ہر معاملے میں ان سے متاثر ہو،مغرب کی خواہش ہے کہ اسی طبقے کے ذریعے بلند آہنگ نعرے اور رس بھرے الفاظ ان معاشروں میں پھیلا کر اپنے مقاصد حاصل کیے جائیں۔ژاں پال سارتر(Jean Paul Sartre،۱۹۰۵ء۔۱۹۸۰ء)نے فرانز فین(Frantz Fanon،۱۹۲۵ء۔۱۹۶۱ء)کی کتاب The Wretched of the Earth کے دیباچے میں لکھا ہے(اردو ترجمہ):

> ”ہم ایمسٹرڈیم(Amsterdam) اور پیرس(Paris) میں افریقیوں یا ایشیائیوں کی ایک جماعت لائیں، چند مہینوں کے لیے انھیں گھمائیں،پھرائیں،ان کے کپڑوں اور آرائش و زیبائش کو تبدیل کریں۔انھیں آداب اور معاشرتی اطوار بھی سکھائیں اور زبان کے کچھ حصے بھی۔مختصر یہ کہ ہم انھیں ان کی اپنی تہذیبی اقدار سے عاری کر دیں اور پھر واپس انھیں ان کے اپنے ملکوں میں بھیج دیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ایسے اشخاص نہیں رہیں گے کہ وہ اپنے دماغ سے سوچیں۔فی الحقیقت وہ ہمارے نمائندے ہوں گے۔ہم یہاں انسانیت اور مساوات کے نعرے بلند کریں گے اور وہ ہماری آواز کی گونج افریقہ اور ایشیا میں سنائیں گے۔”انسانیت اور مساوات“،”انسانیت اور مساوات“۔“(۲)

کسی قوم کے مزاج کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس خطے کی(جہاں وہ قوم آباد ہے)تہذیبی اقدار کو پیش نظر رکھا جائے۔ان اقوام کی معاشرتی قدروں کا احترام کرتے ہوئے اس کے مروجہ معیارات متعین ہوں۔شرق شناسی کے ذریعے مغربی اقوام کا ایک واضح مقصد یہ ثابت کرنا بھی تھا کہ مغرب فکری اور علمی اعتبار سے مشرق کے برعکس ہے،یہاں انگریزی کے معروف شاعر رڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling،۱۹۳۶ء۔۱۸۶۵ء)کی مشہور نظم"The Ballad of East and West"کا ایک مصرعہ پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔وہ کہتا ہے،”مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب،یہ دونوں کبھی جڑواں بھائی نہیں ہو سکتے۔“(۳)فرض کیا اگر یہ دونوں بھائی بن بھی جائیں تو ان کا رشتہ ہابیل اور قابیل کا ہی رہے گا۔اہلِ مغرب کے نزدیک مشرق کاہل،سست الوجود،جذباتی اور دانائی سے بے بہرہ اقوام کی قیام گاہ ہے،اس کے برعکس مغرب تحرک،شعور اور علم ودانش کا منبع اور محور ہے۔مستشرقین کے فکر وتفلسف کے ذریعے ایک ایسا مشرق تشکیل دیا گیا جس کے تحت مغرب کو اعلیٰ اور ارفع ثابت کر کے مشرق کی کمزور اقوام پر اس کے ناجائز قبضے کا جواز فراہم کرنا ضروری تھا۔عالمی نظام کی نبض یورپ کے ہاتھوں میں ہے۔یورپ میں مشرق کی مقدسات کی توہین کے لیے کتابوں اور فلموں کا اجرا بھی اسی مقصد کے تحت کیا جاتا ہے،اور اس کے رد عمل کے طور پر ہمارا جذباتی انداز دراصل یورپی عوام تک ہمارا یہ رویہ پہنچانا ہے جس کی سازش آج تک اورینٹل ازم نے کی ہے۔ان مقاصد کے بطون میں شعوری طور پر مشرقی اقوام

خاص طور پر مسلمانوں کو آمریت پسند، سادہ، کم علم، غیر منطقی اور دہشت گرد بنا کر دکھانا مقصود ہے۔ اس سے ایک خوف کی فضا پیدا کی جاتی ہے جس کے ذریعے اپنے عوام کو پیغام دیا گیا کہ یورپ کو ایک دفعہ پھر ایشیائی اقوام کی یلغار کا خطرہ در پیش ہے۔ اس طرح یورپی عوام کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کا تاثر بھی خراب رہے گا، اور ان مظلوم مسلمانوں کا منظم انداز میں خون بہانے پر کسی قسم کی داخلی مزاحمت کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ نظام کاروباری اداروں، تیل کے سوداگروں، خفیہ مشنری اداروں، فاؤنڈیشنوں، غیر ملکی سفارت کاری، امدادی رقوم اور فوجی تربیت گاہوں کے ذریعے کمزور مشرقی ممالک کے نظام پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ گزشتہ صدی کے ساتویں عشرے تک نظریاتی طور پر خود کو اعلیٰ سمجھنے اور دوسروں کو مغلوب کرنے کی کوششیں جاری رہیں۔ مستشرقین نے اہل مغرب کو مشرق کے صحیح روپ سے آگاہ کرنے کے لیے تسلسل سے کتابیں لکھیں۔

علامہ محمد اقبال(Allama Muhammad Iqbal،۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) نے برطانوی ہند میں جنم لیا۔ انھوں نے اپنی شاعری (فارسی اور اردو) اور نثر کے ذریعے مغرب کے ان تصورات کا بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔ علامہ اقبال مستشرقین کے خیالات کے پس منظر میں موجود عمومی مقاصد سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ وہ بعض مستشرقین کے معترف بھی ہیں لیکن اپنے تحفظات کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اقبال کے خیال میں مستشرقین کی تصانیف مخصوص مقاصد کے لیے لکھی گئیں لیکن ایسا نہیں کہ ان سے کارآمد علوم حاصل نہ ہو سکیں۔ مستشرقین نے مسلمانوں کی تاریخ، زبان وادب، مذہب اور علوم فلاسفہ کے حوالے سے خدمات انجام دی ہیں لیکن ان کا علمی کام بہ حیثیت مجموعی مبتدیانہ نوعیت کا ہے۔ مستشرقین کی تحریر کردہ خالص مذہبی نوعیت کی کتابیں اقبال کو متاثر نہیں کر سکیں، ان کے ایک شناسا حافظ فضل الرحمان انصاری کی خواہش تھی کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ جائیں، انھوں نے جب اس سلسلے میں اقبال سے مشاورت کی تو انھوں نے جواب دیا:

> "جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے، فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے کچھ خاص مقاصد ہیں جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے۔ سادہ لوح مسلمان طالب علم اس طلسم میں گرفتار ہو کر گم راہ ہو جاتا ہے۔"(۴)

پروفیسر تھامس آرنلڈ(Thomas Arnold،۱۸۶۴ء۔۱۹۳۰ء) اقبال کے استاد تھے، انھوں نے اقبال کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے نہ صرف آمادہ کیا بل کہ ان کی رہ نمائی بھی کی۔ آرنلڈ سے عقیدت کے باوجود اقبال انھیں مغربی مقاصد کا ترجمان قرار دیتے ہیں۔ آرنلڈ کی وفات کے موقع پر اقبال بہت افسردہ تھے، انھوں نے ایک درد بھرے لہجے میں کہا "Iqbal has lost his friend and teacher" گفتگو کے دوران میں کسی نے آرنلڈ کی اسلام دوستی کا ذکر کیا تو اقبال نے واضح الفاظ میں کہا:

> "آرنلڈ کی وفاداری صرف خاکِ انگلستان سے تھی۔ وہی ان کا دین تھا، وہی ان کی دنیا۔ انھوں نے جو کچھ بھی کیا، انگلستان کے مفاد کے لیے کیا۔ جب میں (اقبال) انگلستان میں تھا تو انھوں نے مجھ سے براؤن کی تاریخ ادبیات ایران پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی لیکن میں نے اس سے انکار کر دیا کیوں کہ مجھے اس قسم کی تصانیف میں انگلستان کا مفاد کام کرتا نظر آتا تھا۔ دراصل یہ بھی ایرانی قومیت کو ہوا دینے کی ایک کوشش تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ملتِ اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے۔ دراصل مغرب میں فرد کی زندگی صرف ملک کے لیے ہے۔ وطنی قومیت کا تقاضا بھی صرف یہ ہے کہ ملک اور قوم کو ہر چیز پر مقدم رکھا

جائے۔ آرنلڈ کا مسیحیت سے کوئی تعلق تھا نہ اسلام سے بل کہ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو
آرنلڈ کیا ہر مستشرق علم و فضل وہی راستہ اختیار کر لیتا ہے جو مغرب کی ہوس، استعمار اور
شہنشاہیت کے مطابق ہو۔ ان اصحاب کو بھی شہنشاہیت پسندوں اور سیاست کاروں کا دست و
بازو تصور کرنا چاہی۔"(۵)

مستشرقین کے بارے میں اقبال کی پسند ناپسند مسلم مقدسات کے بارے میں ان کی رائے سے بھی وابستہ ہے۔ مثال کے طور پر جان وولف گینگ وان گوئٹے (Johann Wolfgang Von Goethe، ۱۷۴۹ء۔ ۱۸۳۲ء) کی اقبال کے ہاں قبولیت کی ایک وجہ ان کا دیگر مغربی علما کے بر عکس مشرق کے عظیم شخصیات (خاص طور پر پیغمبر اسلام ﷺ) کے بارے میں عمدہ خیالات کا اظہار ہے۔(۶) ان تمام فکری اور مقصدی اختلافات کے باوجود اقبال ذاتی طور پر مستشرقین کے ترتیب و تدوین کے اصول و ضوابط، طریق کار اور حاشیہ نگاری کو تحسین کی نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جگہ کہتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں وسائل ایڈٹ کرنے کے بہت زیادہ ہیں لیکن آخر
میں ہندی مسلمانوں کو بھی تو یہ کام کچھ نہ کچھ شروع کرنا ہے۔"(۷)

اسی طرح ایک جرمن مستشرق گولڈ زیہر (Gold Zehaer) کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ ایک جرمن یہودی ہے اور انگریزی میں نہیں لکھتا۔ اس کی مشہور ترین کتابیں جرمن
زبان میں ہیں اور ان میں کوئی خاص چیز مجھے تو نظر نہیں آئی۔ میں یورپین مستشرقین کا قائل
نہیں کیوں کہ ان کی تصانیف سیاسی پراپیگنڈا یا تبلیغی مقاصد کے تحت تخلیق ہوتی ہیں۔"(۸)

کوئی صاحب علوم اسلامیہ کی تحصیل کے لیے یورپ جانے کے خواہش مند تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں علامہ صاحب سے مشورہ مانگا، جس کے جواب میں انھوں نے کہا:

"مصر جائیے، عربی زبان میں مہارت حاصل کیجیے۔ اسلامی علوم اور اسلام کی دینی اور سیاسی
تاریخ، تصوف، فلسفہ، تفسیر کا بہ غور مطالعہ کر کے محمد عربی ﷺ کی اصل روح تک پہنچنے کی
کوشش کیجیے۔"(۹)

اس موضوع پر علامہ اقبال کا مطالعہ یک رخا نہ تھا، اور نہ ہی وہ محض مستشرقین کے بیان کردہ ہر پہلو کے ناقد ہیں۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی علوم کا بالاستعیاب مطالعہ کر رکھا تھا۔ مغربی دانش گاہوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ شرق شناسی کی روایت میں در آنے والے تعصبات کی نفی کرتے ہیں، اقبال کا ایک شعر ہے:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
میں ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند(۱۰)

یہاں "ابلۂ مسجد" کی ترکیب بہ طور خاص غور طلب ہے۔ یہ ایک قدیم مشرقی علامت ہے۔ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جن کے افکار میں "مشرق" ایک مقدس شے کی علامت ہو اور اس کے علاوہ ان کی نظر انتخاب کسی اور بات کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ "تہذیب کا فرزند" ایک

ایسا کردار ہے جو ہر معاملے میں نہ صرف پیرویِ مغرب کا قائل ہو بل کہ اس کے علاوہ کسی اور نظام فکر کو اعتنا کے لائق ہی نہ سمجھتا ہو۔ اقبال نے دونوں خیالات کی نفی کی ہے۔ وہ اکبر الٰہ آبادی (۱۸۴۶ـ۱۹۲۱ء) کی طرح مشرق کے اندھے مقلد ہیں نہ الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ـ۱۹۱۴ء) کی مانند ہر شے کو انگریزی لالٹینوں کی روشنی میں دیکھنے کے رسیا۔ اقبال کی فکر کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے بجا کہا ہے:

> ''یہ پرانی مشرقیت کی علامت ہے جو ایک جامد مذہبی تصوریت رکھتی ہے اور صرف عقائد و عبادت سے سروکار رکھتی ہے۔ معاملات کی اہمیت کو نظر انداز کرتی ہے اور عقائد و عبادات میں روح پر نہیں لفظ پر اصرار کرتی ہے۔ تہذیب کا فرزند اس مزاج کی نمائندگی کرتا ہے جو مغرب، اس کے افکار و اقدار، اس کی تہذیب، اس کے نظام حیات اور اس کے اداروں کو نہ صرف قبول کرتا ہے بل کہ اس کی تقلید میں ہی اپنی نجات سمجھتا ہے۔ ایک قدامت کا علم بردار ہے اور دوسرا جدت کا۔ ایک کے لیے ماضی سب کچھ ہے اور دوسرے لے لیے افسانہ و افسوں، ایک کے لیے اس کی تاریخ، تہذیب، قانون، سماجی نظام، خاندان، قبیلہ، مذہبی برادری، تقلید تو دوسرے کے لیے یہ دفترِ بے معنی ہے۔ انسان کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ۔ اقبال نے جہاں مغربیت پر تنقید کی ہے وہاں یہ طنز دراصل تہذیب کے فرزندوں پر ہے، لیکن انھوں نے ابلہ مسجد کے علاوہ صوفی، ملا، فقیہہ حرم، پیر حرم کو بھی نہیں بخشا، مشرقیت اور مغربیت کے خلاف ان کے یہ اعتراضات ملحوظ رکھیں۔''(۱۱)

اپنی شاعری میں بھی علامہ محمد اقبال نے برصغیر کے دیگر علما و حکما کی طرح مرعوب ہونے کی بجائے مغرب سے برابری کی سطح پر مکالمہ کیا ہے۔ ان کی مختصر مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر'' (سال تخلیق: ۱۹۳۶ء) ان کے افکار کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ اس زمانے میں تخلیق ہوئی جب دنیا کے فکری رجحانات بہ تدریج نو آبادیات سے نیشنل ازم کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے اقبال نے اس مثنوی میں مسلمانوں کی بجائے مشرقی اقوام سے خطاب کیا ہے۔ مشرق سورج کے طلوع ہونے کی سرزمین ہے یعنی اہل مشرق علم کی روشنی سے مکمل طور پر بہرہ ور ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرق سے علم و دانش کا ایک نیا سورج طلوع ہو رہا تھا لیکن مسلم دنیا تاحال اپنے ''ابوالہولوں'' کی پرستش میں مصروف تھی۔ اس مثنوی میں ایک نئی دنیا کی تعمیر کا مژدہ سنایا گیا ہے جس کی بنیاد عظیم روحانی اور سیاسی اقدار پر رکھی ہے۔ افسوس کہ مسلم اشرافیہ حکمتِ کلیمی سے روشنی حاصل کرنے کی بجائے فرعونی نصب العین کو ملجا و ماوا بنائے ہوئے تھی۔ اقبال اقوام مشرق کو ایک انقلابِ نو کا امید بخش پیغام دیتے ہیں۔ شب کا پردہ چاک ہو رہا ہے اور اس کے بطون سے نئے تصورات کی روشنی بر آمد ہو رہی ہے۔ یورپ اپنی تلوار سے مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے، اس نے لادینیت کا فروغ دے کر انسانیت کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے:

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق
باز روشن می شود ایام شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیرِ گردوں رسم لادینی نہاد[۱۲]

دانش افرنگیاں تیغے بدوش
در ہلاک نوع انساں سخت کوش
آہ از افرنگ واز آئین او
آہ از اندیشہ لادین او
علم حق راساحری آموختند
ساحری نے کافری آموختند[۱۳]

''علامہ اقبال مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کی تخلیق سے چند سال پہلے اپنی تحریروں میں روتی اور بلکتی ہوئی مشرقی اقوام کو ان کے بہتر مستقبل کے لیے ایک نئی ''مجلس اقوام عالم'' ترتیب دینے کا تصور پیش کر چکے تھے۔ اس لیے اس مثنوی میں اقوام مشرق سے خطاب کرنے کی شعوری خواہش موجود ہے۔ یہاں اقبال کے خطبات کے مجموعے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں سے The Principal of Movement in the Structure of Islam میں سے ایک اقتباس بہ طور مثال پیش کیا جاسکتا ہے (اردو ترجمہ):

> ''بہ حالت موجودہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ امم اسلامیہ میں ہر ایک کو اپنی ذات میں ڈوب جانا چاہیے۔ انھیں چاہیے اپنی ساری توجہ اپنے آپ پر مرتکز کر دیں۔ حتیٰ کہ ان سب میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ باہم مل کر اسلامی جمہوریتوں کی ایک برادری کی شکل اختیار کر لیں، حزب وطنی کے زعما ٹھیک کہتے ہیں کہ عالم اسلامی کا ایک حقیقی اور موئثر اتحاد ایسا آسان نہیں کہ محض ایک خلیفہ کے نمائشی تقرر سے وجود میں آجائے۔ اس کا ظہور ہوگا تو آزاد اور خود مختار وحدتوں کی ایک ایسی کثرت میں جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترک روحانی نصب العین نے توافق و تطابق سے بدل دیا ہو۔ میں تو کچھ یونہی دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ شاید مسلمانوں کو بہ تدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے نہ شہنشاہیت بل کہ ایک انجمنِ اقوام، جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے تو محض سہولتِ تعارف کے لیے۔ اس لیے نہیں کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمح نظر محدود کر لیں۔''[۱۴]

شرق شناسوں کے وضع کردہ ''مشرق'' کے رد عمل میں اقبال کی جانب سے پیش کردہ مشرقی اقوام (جن میں اکثریت مسلم ریاستوں کی ہے) کی مجلس کا تصور کے پس منظر میں دراصل مشرقی اقوام کی سیاسی خودمختاری کی خواہش نظر آتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ادب، تہذیب، مذہب، حکومت اور تعلیم وغیرہ کے نعرے لگا کر برصغیر میں ایک تجارتی نظام کو فروغ دیا تھا اور تاجِ برطانیہ بدستور جس کی حفاظت

کر رہا تھا۔ علامہ اقبال اس کی حقیقت سے خواب آگاہ تھے۔ اس مثنوی میں مشرقی اقوام کو استعمار کی غلامی سے آزادی حاصل ہونے کی خوش خبری بھی دی گئی ہے۔

اسی طرح "جاوید نامہ" میں جب مولانا جلال الدین رومی(Moulana Jalal ud din Roomi ۱۲۰۷ء۔۱۲۷۴ء) کی صحبت میں مرید ہندی (علامہ محمد اقبال) سیر افلاک کے لیے روانہ ہوتا ہے تو فلک عطارد پر ان کی ملاقات سید جمال الدین افغانی(Syed Jamal ud din Afghani،۱۸۳۸ء۔۱۸۹۷ء) سے ہوتی ہے۔ یہاں افغانی کے توسط سے اقبال روس کے بالشویکی انقلاب کے رہ نماؤں کو مغرب سے آغاز ہونے والے تازہ بہ تازہ فتنوں سے خبر دار رہنے کا پیغام دیتے ہیں۔ روس دنیا کا سب سے وسیع و عریض ملک ہے، اس کا سر یورپ اور دھڑ ایشیا میں ہے۔ روسی مفکرین کا خیال ہے کہ اگر چہ روس کا عام آدمی طرز زندگی کے لحاظ سے ایشیائی ہے لیکن موقع ملنے پر یورپی حکمت و دانش سے استفادہ کرتا ہے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ روس یورپ کی بجائے ایشیائی علوم وفنون سے رجوع کرے تاکہ اس کا حشر بھی کہیں وہ نہ ہو جو یورپی اقوام کی پیروی میں مسلم دنیا کا ہو چکا ہے۔ اس موقع پر مغرب کے بارے میں اقبال کے تصورات کو ان نکات سے سمجھا جا سکتا ہے:

ا۔ مغرب کی دانشوری اُن کی زندگی کا ساز ہے جب کہ مشرق کے لیے کائنات کا راز عشق میں پوشیدہ ہے۔
ب۔ عشق کے راستے پر چلا جائے تو نتیجہ حق شناسائی کی صورت میں نکلتا ہے، عشق کے کام کی بنیاد دانش سے محکم ہوتی ہے۔
ج۔ اہلِ مغرب کا شعلۂ جوالہ، بجھنے والا ہے کیوں کہ ان کی آنکھ صاحبِ نظر ہے لیکن اُن کے دل مُردہ ہو چکے ہیں۔
د۔ مغرب اپنی ہی تلوار سے کئی زخم کھا کر، اپنا ہی شکار ہو کر زخمی حالت میں پڑا کراہ رہا ہے۔

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدبیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب ونظر کی رنجوری

اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش

مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش(۱۵)

علامہ اقبال (Allama Muhammad Iqbal،۱۹۳۸ء۔۱۹۷۷ء)نو آبادیات اور ایڈورڈ سعید (Edward Said، ۱۹۳۵ء۔ ۲۰۰۳ء)مابعد نو آبادیات کے زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔انھوں نے کولمبیا یونی ورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں،اس کے علاوہ مختلف امریکی جامعات میں جزوقتی تدریس سے وابستہ رہے۔اس دوران میں انھوں نے تسلسل کے ساتھ عالمی سطح کے رسائل میں مضامین ومقالات شائع کروائے۔ان کی چند قابل ذکر کتابوں میں مسئلہ فلسطین(۱۹۷۹ء)، کورینگ اسلام (۱۹۸۱ء)، دنیا، متن اور نقاد (۱۹۸۳ء)،ثقافت اور سامراج (۱۹۹۳ء)دانشورانہ نمائندگی (۱۹۹۵ء)، امن اور اس کے تنازعات (۱۹۹۵ء)، امن عمل کا خاتمہ (۲۰۰۰ء)، جلاوطنی پر غور (۲۰۰۰ء)اور انسانیت اور جمہوری تنقید (۲۰۰۳ء) شامل ہیں۔ایڈورڈ سعید کے افکار وتصورات پر مغرب کے اہل علم (فرانز فنین، مشل فوکو اور انتونیتو گرامچی وغیرہ) کے اثرات ہیں لیکن ”مشرق شناسی“ کو علم کی ایک باقاعدہ شاخ کا درجہ دینے میں ان کردار زیادہ اہم ہے۔

ایڈورڈ سعید نے مشرق کے بارے میں سامراج کے مخصوص تصورات کی مخالفت کی ابتدا سیاسی کی بجائے ثقافتی تفریق سے کی۔اس موضوع پر ایڈورڈ سعید کی اولین کتاب "Beginnings:Intention and method" ہے، لیکن اس کی طرف اہل علم کی زیادہ توجہ نہیں گئی۔اس کتاب میں سعید اپنے فکروتفلسف کی دنیا وضع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آہنگ کے لحاظ سے شاید اس میں وہ منطقیت اور استدلالیت نہیں جو "Orientalism" (اردو ترجمہ: شرق شناسی) کی خصوصیت بنی۔ ۱۹۷۸ء میں ان کی شہرہ آفاق کتاب "Orientalism" (اردو ترجمہ: شرق شناسی) نے شائع ہو کر مغرب اور مشرق کے دانش ور طبقے کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔اس کی حمایت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔”شرق شناسی“ کے مندرجات سے مشرق کو خود اپنی نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی وسیع آگاہی ملتی ہے۔”شرق شناسی“ میں دنیا کو بڑی تفصیل کے ساتھ مغرب کے حقیقی چہرے سے روشناس کیا گیا ہے۔اس عمل کے دوران اہل مغرب کے ہاں بننے والی ایشیا اور افریقہ کی استحصال زدہ اقوام کی دھندلی تصویریں مزید واضح ہو گئی ہیں۔امریکہ اور یورپ میں جنوبی ایشیا کی طرح مشرق وسطیٰ کی تاریخ، سماج، مذہب اور سیاست کے مطالعات کی باقاعدہ ایک روایت موجود ہے۔یہ خطے ان کے قیمتی مفادات کے مراکز ہیں، یہاں اہل علم ودانش کے متعدد جال بچھائے گئے ہیں جو کاروباری کمپنیوں، فاونڈیشنوں، تیل کے سوداگروں، یورپ کے مذہبی مشنریوں، افواج، سفارت کاری کے ذرائع، انٹیلی جنس ایجنسیوں اور تعلیمی وتحقیقی اداروں کے ذریعے رات دن اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے سرگرم ہیں۔انکشافات کے اس عمل میں ایڈورڈ سعید مرض کی تشخیص اور کہیں جراحی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب "Covering Islam" میں بڑی عمدگی کے ساتھ معاصر دنیا کے اجتماعی لاشعور کو موضوع بنایا ہے۔انھوں نے یورپ اور امریکہ کے ان رویوں پر طنز کیا ہے جو ان ممالک نے عام طور پر اسلامی دنیا کے بارے میں اختیار کیے ہیں۔ان کے خیال میں اس بدترین رویے کی ایک بڑی وجہ توانائی کا بحران ہے جس کی وجہ سے ان کی توجہ زیادہ تر خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک میں موجود تیل کے ذخائر کی طرف مبذول رہتی ہے۔مغرب کے عالمی مالیاتی ادارے جب افراطِ زر سے پریشان ہو جاتے ہیں تو دنیا میں ”انقلاب ایران“ کی شکل میں ایک واقعہ رونما ہو جاتا ہے، جس کے بعد تہران میں موجود امریکی سفارت خانے کے ملازمین کو یرغمال بنائے جانے کی خبریں سامنے آتی ہیں۔اس کے ساتھ ہی عرب حکومتوں کے وجود کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔اہل مغرب بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ”اسلام پھر ابھر رہا ہے۔“ایک سیکولر مسیحی ہونے کے باوجود ایڈورڈ سعید نے کتاب کے ترمیم شدہ دوسرے ایڈیشن میں مغرب کے اس خطرناک رجحان کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جس کے تحت مغربی

ذرائع ابلاغ کے ادارے اپنے عوام میں مشرقی باشندوں (خاص طور پر مسلمانوں) کو جنونی، بے عقل اور عیاش بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ایڈورڈ سعید نے سیموئیل پی ہنٹنگٹن (Samuel P.Huntington,۱۹۲۷ء۔۲۰۰۸ء) کے تہذیبوں کے تصادم کے تصور کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ واضح کیا کہ "تہذیبوں کا تصادم" کے مصنف اپنی تھیوری پیش کرتے ہوئے "سرمائے کی عالم کاری" کو فراموش کر دیتے ہیں۔ احمد سہیل کے مطابق مغرب کے بارے میں ایڈورڈ سعید کے تصورات قابل غور ہیں۔ انھوں نے مغربی سامراج کے رطب و یابس کو احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے:

> "انھوں نے یورپی سامراج کے دنوں میں ایشیائی اور اسلامی ثقافتوں کی خوب صورت انداز میں عکاسی کی ہے اور غیر یورپیوں کے اقتدار اور تسلط کو برقرار رکھنے کے یورپ کے اہداف کو انھوں نے بہ طور خاص دلائل کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ یورپ نے ہمیشہ شرق شناسی (Orientalism) کو اپنی طاقت اور فوقیت کے علاوہ دانش کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ سعید نے اپنی شہرہ آفاق کتاب شرق شناسی (Orientalism) میں بڑے مفصل انداز میں یورپ کی اجتماعی نفسیات کی توضیح کی ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ مشرق اور اہل مشرق خود کو مغرب نہیں بلکہ اپنے ذاتی شعور کی آنکھ سے دیکھیں۔ انھوں نے اپنے فکر و تفلسف میں بعض ایسی دوشاخوں (Dichotomies) کو چیلنج کیا ہے جو اس سے پہلے تاریخ میں ایک عالم گیر سچائی کا درجہ رکھتی تھیں۔ خاص طور پر مغربی اور مشرقی تہذیبوں کی (Dichotomy) جہاں یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے کے مد مقابل دکھائی دیتی ہیں۔ ایک مغربی تہذیب ہے جو فاتحانہ انداز آگے بڑھتی چلی جارہی ہے اور دوسری مشرقی تہذیب ہے جو منجمد ہے اور مغرب سے روابط کے سبب وقت کے ساتھ ساتھ طاقتور ہوتی جارہی ہے۔ ان ضابطوں پر طنز کرتے ہوئے ایڈورڈ ڈبلیو سعید کا کہنا ہے کہ یہ ایک جزوی سچائی ہے اور وہ اس کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ ایڈورڈ ڈبلیو سعید (Edward.W.Said) کی تھیوری میں مکمل طور پر مغرب اور اہل مغرب کی پالیسیوں پر طنز کیا گیا۔"[۱۶]

ایڈورڈ سعید فلسطینی نژاد مسیحی تھے، مسئلہ فلسطین کے حوالے سے وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہے۔ فلسطین کے حوالے سے ان کا بیانیہ قدرے جارحانہ تھا۔ انھوں نے فلسطینی تحریک آزادی کے رہ نما یاسر عرفات (Yasir Arafat، ۱۹۲۹ء۔ ۲۰۰۴ء) کے اسرائیلی حکومت کے ساتھ ہونے والے اوسلو معاہدے کی مخالفت کی۔ سعید کے مطابق یہ یاسر عرفات کی سیاسی غلطی تھی کہ انھوں نے بعض معاملات میں اسرائیل کے لیے آسانیاں فراہم کیں۔ خالد سعید کے بہ قول "ایڈورڈ سعید زندگی بھر فلسطین کے سلسلے میں اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس لیے یاسر عرفات سے ان کے زبردست اختلافات کی نوعیت دراصل اسی موقف پر ایمان داری سے قائم رہنے کے باعث تھی۔ ایک اذیت ناک قسم کی ذہنی جلاوطنی اپنی پوری حسیت کے ساتھ ان (ایڈورڈ سعید) کے وجود سے اپنا رشتہ شاید ہمیشہ کے لیے قائم کر چکی تھی۔"[۱۷] ان کے نزدیک فلسطینی قومیت کا تصور مذہبی نہیں بل کہ سیکولر تھا۔ مغربی دنیا جب ایک صہیونی ریاست اسرائیل کی سرپرستی کرتی ہے تو وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ سعید کو اس بات پر شدید

حیرت ہوتی ہے کہ مغرب معصوم لوگوں کے پتھروں سے کیے گئے حملوں کا جواب گولیوں بل کہ راکٹوں سے دینے والی قوت کا حامی ہے۔ایڈورڈ سعید نے فلسطینیوں کی نسل کشی کے حوالے کی کی جانے والی منظم کوششوں کا پردہ بھی فاش کیا ہے۔اپنی کتاب ''مسئلہ فلسطین''میں اس بارے میں کہتے ہیں:

''فلسطینیوں کو جس تکلیف دہ وجودی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کا تعلق ان کی سیاسی بقا سے ہے جس کی ضرورت وہ سبھی محسوس کرتے ہیں۔لیکن مسئلہ صرف سیاسی بقا ہی کا نہیں،اس کے ساتھ وہ نتائج و عواقب بھی شامل ہوگئے ہیں جو علاقے سے محروم ہونے اور سیاسی طور پر اجنبیبن جانے کی وجہ سے ظہور میں آئے ہیں اور ان نتائج و عواقب نے صورت حال کو اور بھی گمبھیر بنادیا ہے۔فلسطینیوں میں یہ احساس تو ضرور ہے کہ ان اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے مقامات پر ان کے دوسرے مسلمان یا عرب بھائی بند موجود ہیں کے درمیان ایک رشتہ مواخات کا ہے لیکن اس احساس پر بھی اس تکلیف دہ وجودی صورت حال کی،جس کا انھیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے، چھاپ لگی ہوئی ہے۔فلسطینیوں کے نزدیک دوسرے عرب ایک سطح پر ان کے ساتھ اخوت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں لیکن ایک دوسری سطح پر ان دونوں کے درمیان ایک ایسی خلیج بھی حائل ہے جسے پاٹنا ممکن نہیں۔یوں کہیے کہ تعلقات کی یہ متناضع صورت حال زمانۂ حال میں پیدا ہوئی ہے کیوں کہ یہ زمانۂ حال کا مسئلہ ہے۔معاصر زمانے کا مسئلہ جو فلسطینیوں اور دوسرے عربوں کو ایک دوسرے کے قریب بھی لاتا ہے اور انھیں ایک دوسرے سے الگ بھی کرتا ہے۔ایک فلسطینی کے نزدیک عربوں کا ایک ماضی بھی ہے اور مشرق وسطیٰ کا عربوں کا ایک مشترکہ مستقبل بھی۔لیکن اب زمانۂ حال میں کیفیت یہ ہے کہ فلسطینی قوم نہ صرف عدم استحکام کا شکار ہے بل کہ اسے یہ خطرہ درپیش ہے کہ وہ کہیں تحلیل ہی نہ ہو جائے۔''(۱۸)

ایڈورڈ سعید امریکہ کی جارحانہ ریاستی پالیسیوں کو ہرمن میلول(Herman Melville،۱۸۱۹ء۔۱۸۹۱ء) کے ناول Moby-Dick کے ایک کردار سے مماثل قرار دیتے ہیں جو نقرئی رنگ کی مچھلی کی تلاش میں اپنی ایک ٹانگ ضائع کروالیتا ہے۔سعید کے خیال میں اسامہ بن لادن (Usama bin laden،۱۹۵۷ء۔۲۰۱۱ء) ایک مجرم ہونے کے باوجود امریکہ کے لیے ایک موبی ڈک ہے۔امریکہ اسے نفسیاتی حوالے سے ساری دنیا پر یا ساری دنیا کو اس پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر امریکہ اور یورپ کے ڈسکورس کی ایڈورڈ سعید کے خیالات کی روشنی میں توضیح پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''امریکی اور برطانوی اکیڈمک دانش ور،ایک ارب مسلمانوں کے بارے میں،جو نصف درجن (حقیقتاً کہیں زیادہ) زبانیں بولتے ہیں، غیر ذمہ دارانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔وہ اسلام کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کے بارے میں کبیری تعلیمات سے کام لیتے ہیں اور اسلام اور

جمہوریت، اسلام اور انسانی حقوق، اسلام اور ترقی میں عدم مطابقت سے متعلق ڈھٹائی سے آرا
قائم کرتے ہیں۔ سعید اسلام کو ایک مذہب اور کلچر سمجھتے ہیں؛ یہ دونوں کسی واحد کلیے کے
اسیر نہیں ہیں؛ ان کی متعدد تعبیریں ہیں۔ وہ شامی مسلم دانش ور ادونس کے حوالے سے کہتے
ہیں کہ کیا اسلام حکمرانوں کا ہے، یا انحراف پسند شعرا اور مسالک کا؟ مغرب اسلام کے غیر
متجانس کردار پر زور دیتا ہے، اور اس کی تاریخ میں عقلیت و سائنس اور اجتہادی فکر کے حامل
عناصر کی نفی کرتا ہے۔ یہاں سعید کا اشارہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اسلام سے متعلق
اس امریکی ڈسکورس کی طرف ہے، جس میں اشتراکیت کی جگہ اسلام کو ملی ہے۔ سعید کے یہ
خطبات گیارہ ستمبر (نائن الیون) کے واقعے سے پہلے دیے گئے تھے۔ اس واقعے کے بعد اسلام
کی بابت امریکی ڈسکورس میں شدت پیدا ہوئی ہے۔"(۱۹)

فی الوقت ایڈورڈ سعید کی فکری اہمیت کا تعین آسان کام نہیں، کیوں کہ ان کی دل چسپی کا میدان ادب اور موسیقی سے لے کر مشرق کی نئے سرے سے بازیافت کے عمل تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کا شمار سامراجی نظام کے بڑے ناقدین میں ہوتا ہے۔ اپنی تحریروں میں سعید نے مغربی ایجنڈے کی دلائل کے ساتھ نفی کی۔ اس کوشش میں جہاں ان کے خیالات کو تیسری دنیا کے ممالک میں سراہا گیا، وہاں انھیں تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑا۔

علامہ اقبال ہندوستان میں پیدا ہوئے، جب یہ ملک برطانوی نوآبادیات کا حصہ تھا۔ ایڈورڈ سعید کا تعلق پس نوآبادیات کے زمانے سے ہے، پیدائش کے وقت ان کا وطن بھی برطانیہ کے قبضے میں تھا، ان کے بچپن میں صہیونی حکومت بن چکی تھی، جس کے نتیجے میں انھیں اپنے والدین کے ہم راہ مصر کی جانب نقل مکانی کرنی پڑی تھی۔ تھوڑے فرق کے ساتھ ان کے عہد کے مسائل تقریباً ایک جیسے ہیں۔ شرق شناسی (Orientalism) کے بارے میں علامہ محمد اقبال اور ایڈورڈ سعید کے خیالات میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں شخصیات عالمی طاقتوں کی چیرہ دستیوں کی چشم دید گواہ ہیں۔ انھوں نے مغربی اقوام کے طاقت کے ڈسکورس کا بہ خوبی مشاہدہ کیا۔ اقبال مذہبی افکار کے حامی مسلمان تھے۔ اس کے برعکس سعید سیکولر تصورات کے حامی مسیحی تھے۔ اس کے باوجود دونوں (اقبال اور سعید) ملوکیت اور مذہبی شدت پسندی کی حمایت نہیں کرتے۔ اقبال نے اپنی تحریروں میں جنگ بلقان و طرابلس اور اسی نوع کی دوسری جنگیں مسلط کرنے پر مغرب کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ سعید نے ویت نام اور عراق پر کیے جانے والے امریکی حملوں سے اختلاف کیا۔ اقبال عرب ممالک کے بادشاہوں کی پالیسیوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "عربوں کو چاہیے کہ اپنے قومی مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے عرب ممالک کے بادشاہوں کے مشوروں پر اعتماد نہ کریں، کیوں کہ بحالاتِ موجودہ ان بادشاہوں کی حیثیت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ضمیر و ایمان کی روشنی میں فلسطین کے متعلق کسی فیصلے یا کسی صائب نتیجے پر پہنچ سکیں۔"(۲۰) ایڈورڈ سعید کے مطابق

"مشرق میں اسلام اور اس کے مذہبی رہ نماؤں کے لب و لہجے کی اجارہ داری ہے اور اس طبقے
نے اسلام کو اپنی باتوں سے بدنام کر رکھا ہے۔ یہ طبقہ مسلمانوں نے دل و دماغ پر قابض بھی
ہے۔"(۲۱)

شرق شناسی کے حوالے سے علامہ محمد اقبال (Allama Muhammad Iqbal، ۱۹۳۸ء۔۱۸۷۷ء) اور ایڈورڈ سعید (Edward Said، ۱۹۳۵ء۔۲۰۰۳ء) کے خیالات کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک ایسے مغرب کے دلدادہ ہیں جو تعصب سے بالاتر ہو اور ان کے پیش نظر ایک ایسا مشرق ہے جو اپنی اقدار کے تحفظ کے ساتھ ساتھ جدید علوم و فنون میں ترقی کی منزلیں طے کرے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ اصلاحی، شرف الدین، مستشرقین: استشراق اور اسلام، اعظم گڑھ: معارف دار المصنّفین، س ن، ص ۸۵

۲۔ سجاد باقر رضوی (مترجم)، افتادگان خاک، فرانز فینن، لاہور: نگارشات، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲

تفصیل کے مزید عبارت کچھ یوں ہے:

In the colonies the truth stood naked, but the citizens of the mother country preferred it with clothes on: the native had to love them, something in the way mothers are loved. The European elite undertook to manufacture a native elite. They picked out promising adolescents; they branded them, as with a red-hot iron, with the principles of Western culture; they stuffed their mouths full with high-sounding phrases, grand glutinous words that stuck to the teeth. After a short stay in the mother country they were sent home, whitewashed. These walking lies had nothing left to say to their brothers; they only echoed. From Paris, from London, from Amsterdam we would utter the words" Parthenon! Brotherhood "!and somewhere in Africa or Asia lips would open . . ." thenon! Therhood "!It was the golden age "

Frantz Fanon, The wretched of the earth, New York: Grove press, 1961 a.d, P13

3. Oh! East is East and West is West, and never the twain shall meetRudyard Kipling, The Ballad of East and West, 1889, poetry lovers page.com

۴۔ شیخ عطاءاللہ، اقبال نامہ، لاہور: شیخ محمد اشرف تاجر کتب، س ن، ص ۳۹۸

۵۔ ڈاکٹر سید نذیر نیازی، مکتوبات اقبال، کراچی: اقبال اکادمی، ۱۹۵۷ء، ص ۹۶،۹۷

۶۔ جان وولف گینگ وان گوئٹے (Johann Wolfgang von Goethe، ۱۷۴۹ء۔۱۸۳۲ء) نے اپنے والد کی خواہش کے مطابق اعلیٰ تعلیم کے لیے لاپزگ یونی ورسٹی میں قانون کے شعبے میں داخلہ لیا لیکن بعد میں اس کے خیالات تبدیل ہو گئے اور وہاں سے وہ فائن آرٹس کے ایک گریجویٹ کی حیثیت سے فارغ التحصیل ہوا۔ ادب اور فلسفہ اس کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ گوئٹے مشرقی افکار سے کی روشنی سے بھی علم کشید کرتا ہے۔ اپنی تخلیقات اور تخیلات میں گوئٹے حافظ شمس الدین شیرازی، شیخ فرید الدین عطار، شیخ سعدی شیرازی اور فردوسی سے متاثر ہے۔ بقول اقبال "بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنا ہی عکس نظر آتا تھا۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی

سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے(پیام مشرق)۔"کہاجاتا ہے کہ مشرق اور مشرقی علوم کے ساتھ گوئٹے کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اپنے لباس،نشست وبرخاست اور عادات واطوار میں وہ مشرق کی پیروی کرتا تھا۔اس کے دیوان میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔اپنی ایک نظم میں اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کا کہنا ہے کہ "یہ حماقت ہے کہ تو ہر معاملے میں اپنی رائے کی تعریف کرتا ہے۔اگر اسلام کا معنی اپنے امور اور ارادوں کو خدا کے سپرد کرنے کا نام ہے تو ہم سب مسلمان ہیں اور مسلمان ہی مریں گے"تفصیل کے لیے دیکھیے:شجاع الدین عنقا،(مترجم)،دیوان شرقی،گوئٹے،تہران،۱۳۳۷اش،ص۲۸

اسی طرح قرآن پاک کے بارے میں گوئٹے کے خیالات میں کسی قسم کا ابہام نہیں۔اس کے دیوان میں ایک شعر ہے:

The God belongs the East

The God belongs the West

یہ قرآنی آیت "للہ المشرق والمغرب"کا ترجمہ ہے۔اسی طرح ایک اور جگہ وہ کہتا ہے:

When do business,

or write poetry,

Keep me O Lord on the straight path

یہاںStraight Path"اھدنا لصراط المستقیم" کی ترجمانی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:شجاع الدین عنقا،(مترجم)،دیوان شرقی،گوئٹے، تہران،۱۳۳۷اش،ص۶۹

ڈاکٹر اناماری شمل (Annemarie Schimmel،۱۹۲۲ء۔۲۰۰۳ء) کے مطابق گوئٹے کتاب مقدس سے ماخوذ موضوعات پر ڈرامے تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔بہ حوالہ:رحیم بخش شاہین،ڈاکٹر،(مترجم)،مشرق ومغرب کا سنگم،این میری شمل،سہ ماہی ادبیات،اسلام آباد،جلد۱۸،شمارہ ۱۹۹۲،۵ء،ص۱۶۹

اقبال فکری اعتبار سے اسلام اور اس کے عقائد و نظریات سے متاثر تھے،اس لیے ان کی علمی ترجیحات میں گوئٹے کا اہم مقام پر فائز ہوتا فطری بات ہے۔انھوں نے گوئٹے کے آخری الفاظ"روشنی اور تیز کردو۔یہ بہت خوب صورت ہے"کا بہ طور خاص تذکرہ کیا ہے۔موت چوں کہ پے در پے انکشافات کا عمل ہے،اس لیے ایسے جملے وہی انسان بول سکتا ہے جو زندگی کے اس پر اسرار مرحلے پر ابدی حسن وصداقت کے روبرو کھڑا ہو۔علامہ اقبال نے نہ صرف اپنا شعری مجموعہ گوئٹے سے منسوب کیا بل کہ اس کی اس کے ایک منظوم فنتاڑیے"The Mohamet geasang"کا "جوئے آب"کے عنوان سے ترجمہ بھی کیا۔اس کے بعد اردو اور انگریزی میں اس کے تراجم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

۷۔ شیخ عطااللہ،اقبال نامہ،جلد اول،لاہور:شیخ محمد اشرف تاجر کتب،س ن،ص۲۲۵

۸۔ شیخ عطااللہ،اقبال نامہ،جلد دوم،لاہور:شیخ محمد اشرف تاجر کتب،۱۹۵۱ء،ص۹۶

۹۔ تحسین فراقی،ڈاکٹر،اقبال اور ثنائے خواجہ ﷺ(مضمون)، مشمولہ:اقبال کی نعت کا فکری اور اسلوبیاتی مطالعہ،مرتب: صبیح رحمانی،۲۰۱۸ء کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۶ء،ص۳۱۶

۱۰۔ محمد اقبال،علامہ،کلیات اقبال(اردو)،لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۰ء،ص۲۳۵

۱۱۔ آل احمد سرور،اقبال اور نئی مشرقیت(مضمون)،مشمولہ:اقبال اور مغرب،مرتبہ:آل احمد سرور،سری نگر:اقبال انسٹی ٹیوٹ،۱۹۸۱ء،ص۴۳

۱۲۔ محمد اقبال،علامہ،مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر،شرح،خواجہ عبدالحمید یزدانی،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء،ص112

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ محمد اقبال، علامہ، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم، سید نذیر نیازی، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۵۷ء، ص ۲۲۱
عبارت کا اصل متن کچھ اس طرح سے ہے:

"For the present every Muslim nation must sink into her town deeper self, temporarily focus here vision on herself alone, untill all are strong and powerful to form a living family of republics.A true and living unity, according to the nationalist thinkers, is not so easy as to be achieved by a merely symbolical overlordships. It is truly manifested in a multiplicity of free independent units whose racial rivalries as adjusted and harmonized by he unifying bond of a common spiritual. It seems to me that God is slowly bringing home to us the truth that Islam is neither Nationalism nor Imperialism but a League of Nations which recognizes artificial boundaries and racial distinctions for facility of reference only, and not for restricting the social horizon of its members "

۱۵۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۵۶، ۳۵۳، ۲۲۶، ۲۳۵، ۱۱۲

۱۶۔ احمد سہیل، پس نو آبادیاتی نظریہ اور عالمی ادبیات (مضمون)، مشمولہ: کراچی: سہ ماہی صریر، سالنامہ ۱۹۹۳ء، ص ۲۲۱

۱۷۔ خالد سعید، جلاوطن ذہن کا سفر، مشمولہ: سہ ماہی اردو ادب، دہلی: کتاب ۲۰۰۳ء، ص ۵۰

۱۸۔ ایڈورڈ سعید، مسئلہ فلسطین، مترجم: شاہد حمید، جہلم: بک کارنر، ۲۰۲۱ء، ص ۳۱۲

۱۹۔ نیر، ناصر عباس، عالمگیریت اور دیگر مضامین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص ۲۷

۲۰۔ ایڈورڈ سعید، مسئلہ فلسطین، ص ۳۱۲

۲۱۔ فتح محمد ملک (مرتب)، فلسطین اردو ادب میں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۲۳۷

کتابیات

آل احمد سرور، (مرتب)، اقبال اور مغرب، سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۱ء

اصلاحی، شرف الدین، مستشرقین: استشراق اور اسلام، اعظم گڈھ: معارف دار المصنّفین، س ن

ایڈورڈ سعید، مسئلہ فلسطین، مترجم، شاہد حمید، جہلم: بک کارنر، ۲۰۲۱ء

سجاد باقر رضوی (مترجم)، افتادگان خاک، فرانز فینن، لاہور: نگارشات، ۱۹۶۹ء

صبیح رحمانی، سید، (مرتب) اقبال کی نعت کا فکری اور اسلوبیاتی مطالعہ، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۸ء

عطاالله، شیخ، اقبال نامہ، جلد اول، لاہور، شیخ محمد اشرف تاجر کتب، س ن

عطاالله، شیخ، اقبال نامہ، جلد دوم، لاہور، شیخ محمد اشرف تاجر کتب، ۱۹۵۱ء

فتح محمد ملک (مرتب)، فلسطین اردو ادب میں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (اردو)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء
محمد اقبال، علامہ، مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مسافر، شرح، خواجہ عبدالحمید یزدانی، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
محمد اقبال، علامہ، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، مترجم، سید نذیر نیازی، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۵۷ء
نذیر نیازی، سید، مکتوبات اقبال، اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۵۷ء
نیر، ناصر عباس، عالمگیریت اور دیگر مضامین، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء

اردو رسائل

سہ ماہی، اردو ادب، کتاب ۳۲۲، دہلی: ۲۰۰۳ء
سہ ماہی، صریر، کراچی: سالنامہ، ۱۹۹۳ء